محمد حنیف ندوی

تاثرات

مسئلہ اصلاحِ نصاب ——

محکمہ اوقاف کے اس اقدام کی اسلامی حلقوں میں تعریف کی جائے گی کہ عربی علوم کی اشاعت و تعلیم کے لیے ایک موزوں اور شایانِ شان درس گاہ کی بنیاد ڈالی جارہی ہے۔ دینی تعلیم ہماری تہذیب کی جڑ ہے اور ہمارے تمدنی رجحانات کی پہلی اور بنیادی اینٹ ہے، اسی پر ہماری زندگی کا قصرِ دل کشا تعمیر ہوتا ہے اور یہی وہ ہمارا مایۂ ناز سرمایہ ہے جس کو بڑھانا اور ترقی دینا ہمارے فرائضِ ملی میں اوّلین اہمیت کا حامل ہے۔

اونچے قسم کے دار العلوم اور علم و عرفان کے قابلِ فخر گہوارے روز روز قائم نہیں ہوتے۔ بلکہ خاص نوع کی تاریخی مناسبتوں سے معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ لہٰذا پہلے ہی قدم پر خوب سوچ سمجھ لینا چاہیے کہ اس سے ہماری کس قسم کی توقعات وابستہ ہیں۔ اور اس میں ہم کس ڈھنگ کے علماء تیار کرنا چاہتے ہیں؟

اس میں شبہ نہیں کہ قدیم مدارسِ نظامیہ نے علم و فنون کی شمع کو مدتوں فروزاں رکھا ہے۔ اور نامساعد حالات میں بھی انھوں نے ایسے ایسے نامور اور جیّد علماء پیدا کیے ہیں کہ جن کی نظیر نہیں ملتی۔ یہی نہیں بطورِ امرِ واقعہ کے اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لیجیے کہ مشترکہ ہندوستان میں اسلامی اقتدار کی

اشاعت و تبلیغ میں ان علماء کا شاندار حصّہ ہے۔ اور انھیں مدارس سے فیض یافتہ حضرات کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے انگریزی استعمار کے خلاف علمِ جہاد بلند کیے رکھا ہے، عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا ہے، دینی و علمی رجحانات کو اُبھارا ہے، رسم و رواج کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے اور کوشش کی ہے کہ پہلے کی طرح لوگوں کی دلچسپیاں ہر حالت میں دین کے ساتھ وابستہ رہیں۔

مگر اس عرصے میں زمانے نے ایک نئی کروٹ بدلی ہے، خیالات و افکار کے آفتابِ تازہ نے ایک نئی صبح و شام کا اہتمام کیا ہے۔ زندگی کے سانچے بالکل ہی مختلف قسم کے اسلوبِ حیات کو جنم دینے والے ہیں اور علوم و فنون کی تازہ کاریاں انسان کے عقائد و ایمانیات کو بالکل ہی نئی سمت اور نئے رُخ عطا کرنے پر آمادہ ہیں۔

غور تو کیجیے آج وہ پہلے سے حالات اور پہلی سی آب و ہوا کہاں ہے؟ وہ قبۂ زرنگار، وہ ستم پیشہ اور دیوتاؤں کا مفروضہ آسمان جو آئینے سے زیادہ شفاف اور فولاد و آہن سے بڑھ کر مضبوط تھا کیا ہوا؟ نیوٹن، کیپلر، برونو اور گلیلیو کی علمی کاوشوں نے موجودہ عالم کا تصور ہی بدل دیا ہے۔ اب نہ پرانا اور کہنہ آسمان ہم پر سایہ فگن ہے اور نہ زمین ساکن۔ اور مرکزِ کائنات۔ ارسطو کی منطق کے پرزے سہروردی، غزالی اور ابن تیمیہ نے تو اڑائے ہی تھے بیکن نے اس پر استقرار کا اضافہ کر کے سائنس کی ترقیات کے لیے دروازے کھول دیے۔ اور حال ہی میں مسٹر آئر نے ایجابی منطق کو اس طنطنے کے ساتھ پیش کیا کہ ادعائیات کی دنیا میں تہلکہ سا مچ گیا۔ عقائد اور مابعد الطبیعیات کی استواریاں اپنی ساکھ کھو بیٹھیں اور نئی طبیعیات قدیمہ سے ترقی کی اتنی منزلیں طے کر لی ہیں کہ اس میں اور پرانی طبیعیات میں کوئی قدر مشترک ہی معلوم نہیں ہوتا، قدیم نظریے ایک ایک کر کے غلط ثابت ہو گئے ہیں۔ اور سائنس نے ارتقاء و تقدم کی بالکل ہی نئی اساسیں دریافت کر لی ہیں۔ مادہ پہلے کی طرح بے جان اور سراپا انفعال پذیر شے نہیں رہا۔ بلکہ اس نے متحرک کہربائی نقاط کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب وزن اور مکانیت اس کا وصف لازم نہیں رہا۔ بلکہ یہ اس قوت اور توانائی سے روشناس ہو رہا ہے کہ جو اپنے اندر بے پناہ تباہی کے مضمرات رکھتی ہے۔ سائنس کے اس جدید انکشاف نے روح کی جداگانہ حیثیت کو خصوصیت سے نقصان

پہنچایا ہے کہ کمیت کیفیت سے بدل سکتی ہے۔ اس سے اس کے حدود و اختیار میں بہت اضافہ ہوا ہے اور انسان سوچنے لگا ہے کہ عقل و خرد کا یہ سارا کارخانہ کہیں مادہ ہی کی کرشمہ سازی نہ ہو۔ نفسیات نے علاوہ اس کے کہ انسان کو مجبور ثابت کرنے کی بے حد کوشش کی ہے اور روح کے غیر مادی تصور کی نفی کی ہے، تعلیم و تربیت کے ایسے پیمانوں کو پیش کیا ہے جن سے تعزیرات و حدود کے پرانے عقیدہ کو گزند پہنچا ہے۔ اس علم نے یہ بتایا ہے کہ جرم عقوبت سے زیادہ اصلاح کا طالب ہے۔ اور بڑے سے بڑے مجرم کی صلاحیتوں کو بھی بغیر ادنیٰ سزا دیے ایک اچھے شہری کی حیثیت سے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

معاشرہ کا پرانا تصور بھی یکسر بدل گیا ہے اب یہ ساکن اور غیر متغیر نہیں رہا۔ بلکہ موجودہ ٹیکنالوجی نے اس کی برق رفتاریوں میں بلا کا اضافہ کر دیا ہے اس سے اقدار حیات کے دائمی و ابدی اصولوں کے احترام و توقیر کے درجوں میں معتد بہ کمی واقع ہو گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ تغیر و انقلاب کے اس رستاخیز عالم میں علم کا پرانا انداز باقی رہ سکتا ہے اور اس دور کے علماء کسی طرح بھی عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو ہر نئے حملے سے ہراساں ہو کر سپر ڈال دیتے ہیں اس لیے کہ ہمارا دامن ماضی کی درخشانیوں سے ہمیشہ مالا مال رہا ہے۔ ہمارے پاس جچے تلے عقائد کا ایک قابل اعتماد ذخیرہ ہے۔ ہم مستقل بالذات تہذیبی تصورات رکھتے ہیں۔ ہماری اپنی شاندار تاریخ ہے، ہمارے ایسے ایسے اعلیٰ کارنامے اور فتوحات ہیں جن پر ہمیں ہمیشہ فخر و ناز رہے گا۔ کمی صرف یہ ہے کہ علم نے اپنا پرانا چولا بدل لیا ہے اور حالات نے تصورات و عقائد کا بالکل ہی نیا پیراہن زیب تن کر لیا ہے۔ اس بنا پر ہمیں اپنے نصاب تعلیم کو اس انداز سے مقرر کرنا چاہیے کہ اس سے موجودہ تقاضوں کی بہ احسن وجہ تکمیل ہو سکے۔

اس سلسلے میں اس غلط فہمی میں قطعی مبتلا نہیں رہنا چاہیے کہ موجودہ تہذیب نے، موجودہ علوم نے اور موجودہ ترقیات نے جن جن تصورات کو جنم دیا ہے ہمیں ان کو بجنسہٖ قبول کر لینا چاہیے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے علماء کو تغیر و ارتقا کی ان کڑیوں سے بالتفصیل واقف رہنا چاہیے جو چند صدیوں سے ہماری فکری و عملی زندگی پر اثر انداز ہو رہی ہیں اور یہ دیکھنا چاہیے کہ ان میں سے کن عقائد اور تصورات کو ہم اپنی عملی و فکری زندگی میں سمو سکتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ نہ صرف نصاب کی اصلاح کی جائے بلکہ یہ ہے کہ اس میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ تبدیلی نصاب کا یہ ایک پہلو ہے دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو نصاب اب تک پڑھایا جاتا ہے وہ سخت ناقص غیر منطقی اور غلط ہے۔ اس میں متعدد خامیاں ہیں۔ بڑی خامی

یہ ہے کہ اس میں ایسے مضمون کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جن سے تعمیر کردار کا کام لیا جا سکتا ہے جو ذہن کے ساتھ براہ راست تعلق و اتصال کے داعیوں کو اکسا سکتا ہے اور ذوق و وجدان اور بصیرت و روشنی پیدا کر سکتا ہے یعنی تصوف۔ حالانکہ قطع نظر اس کے ان فوائد کے اس کی ایک حیثیت ادبی بھی ہے۔ اور تنہا یہ حیثیت ایسی ہے کہ جس کی وجہ سے اس کو درس نظامیہ میں ہونا چاہیے تھا۔ دوسرا نقص اس کا غیر ضروری پھیلاؤ ہے چنانچہ صرف و نحو کی کئی کئی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ یعنی طالب علم صرف کافیہ پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ جب تک شرح جامی الفیہ ابن مالک اور اس کی متعدد شروح نہیں پڑھ لیتے دوسری کتابوں کو چھوتے بھی نہیں معقولات میں اس سے کہیں زیادہ غیر معقول روش اختیار کی جاتی ہے۔ شمس بازغہ، شرح اشارات اور ملا مبین کیا کیا نہیں پڑھا جاتا، بالکل یہی انداز اصول فقہ اور معانی کی تعلیم کے سلسلے میں اختیار کیا جاتا ہے۔ اس غیر ضروری پھیلاؤ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل مضامین جو حاصل علم ہیں ان کی طرف پوری پوری توجہ مبذول نہیں ہو پاتی مثلاً قرآن حکیم جو مخزن معارف ہے اور ہمارے دینی علوم و عقائد کی جان ہے ہمارے نظام تعلیم میں سخت بے اعتنائی کا شکار رہتا ہے۔ طالب علم زیادہ سے زیادہ بیضاوی کے ڈھائی پارے پڑھتے ہیں۔ اور بہت ہوا تو کسی کسی نے کشاف کے کچھ حصے پڑھ لیے اس سے زیادہ محنت و کاوش کا اسے مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ اس کو ہمارے ہاں بجائے ایک کتاب کے مستقل مضمون ہونا چاہیے اور اس ڈھنگ سے اس کو پڑھانا چاہیے کہ طلبہ اس کے تمام متعلقات سے بہرہ ور ہو سکیں۔

ہماری رائے میں قرآن حکیم سے کما حقہ واقفیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو کئی تعلیمی مرحلوں میں تقسیم کر دیا جائے پہلے مرحلے میں مثلاً اس کے سلیس اور شستہ ترجمے کا طلبہ میں ذوق پیدا کرنا چاہیے، دوسرے مرحلے میں توجہ کا مرکز حل لغات اور اس کی ادبی و لسانی اہمیتوں کو قرار دینا چاہیے۔ تیسرے مرحلے میں یہ بتانا چاہیے کہ قرآن کی تشریح و تفسیر کے اصول کیا ہیں، اس میں کیا کیا موضوع زیر بحث آئے ہیں، عقائد کا کیا عالم ہے، عبادات کا نظام کیا ہے، اجتماعی نظریات میں اس کی ہدایت و رہنمائی کن اصولوں پر مبنی ہے۔ اس کی مشکلات کیا ہیں اور علمائے تفسیر نے ان مشکلات کو کیونکر حل کیا ہے۔ چوتھے مرحلے میں کوشش کرنا چاہیے کہ طلبہ بجائے تعلیم کے مطالعے میں مصروف ہوں اور قرآن سے متعلق اہم کتابوں سے روشناس ہوں اس منزل میں انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تفسیر کے بارے میں ہمارے سلف کی روش کیا تھی متکلمین نے تشریح و تفسیر کی کن جدتوں کو اپنایا اور موجودہ دور میں۔ عالم اسلامی میں اس کتاب ہدیٰ کو کس طرح پیش کیا جا رہا ہے یعنی جہاں ہمارے طلبہ قرطبی، رازی اور زمخشری کی مساعی جمیلہ سے واقف ہوں وہاں انھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ عبدہ، طنطاوی، فراہی اور آزاد نے کس کس ڈھنگ سے قرآنی جواہر پاروں کو اپنی تصنیفات میں سجایا ہے۔ (باقی)